احمد جاوید
ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی، لاہور

حالی کا اخلاقی اور جمالیاتی شعور
کچھ ابتدائی باتیں

In this paper the writer has evaluated Molana Haali's moral and aesthetic consciousness in the light of contemporary sensibility. It has been asserted that Haali was clear about the reasons for the decline of Muslim civilization in the subcontinent. Therefore, he was able to prescribe a solution through his writings for the problems Muslims faced. This prescription helped in nourishing not only our literary tradition but also civilizational and academic.

ہر تہذیب اگر وہ تہذیب بالکل مسترد نہ ہوچکی ہو تو اس میں سے کچھ ایسی شخصتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت سے اس تہذیب کا عنوان بننے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اور جن کی انفرادی حیثیت بھی اس تہذیب کو اس کی درکار تعریفات فراہم کر دیتی ہیں۔ مولانا الطاف حالی ہند اسلامی تہذیب میں پیدا ہونے والی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی تہذیب میں جاری کمالات کو محفوظ رکھا اور اس تہذیب میں در آنے والے نقائص کے ازالے کی واضح اور پُر تاثیر صورتیں نکالیں۔ ہماری روایت کے جو اجزاء بھی ہماری تہذیبی اور نفسیاتی نشو ونما کے لیے درکار تھے حالی نے ان اجزء کی صرف نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ اپنے نثری اور شعری کاموں میں ان اجزء کو اس طرح محفوظ کیا اور ان اجزائے کمال کو وہ سیاق و سباق فراہم کیا جس میں ان اجزاء کی نمو ہو سکے، ان اجزاء میں تکمیل کا عمل جاری رہ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ حالی اپنی نظر سے اس خطے کی مسلم تہذیب میں جو زوال کی نشانیاں اور اسباب دیکھ رہے تھے اس کے بارے میں بھی ان کا ذہن بہت واضح تھا۔ ان اسباب زوال کو دور کرنے کا جو نسخہ انہوں نے اپنی تحریروں میں تجویز کیا اس نسخے کی تاثیر سے ہماری ادبی ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تعلیمی روایت میں بھی بڑے بڑے اداروں، بڑے بڑے رجحانات اور اہم دبستانوں کا ظہور ہوا۔ لہٰذا حالی کو دیکھنا کسی شخص کو دیکھنے کا عمل نہیں ہے، گو کہ ہم ان کی شخصیت اور ان کی انفرادیت کے مظاہر کو بھی دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ حالی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو دیکھنے کے لیے ان کی تہذیب کی میکانیات اور اصول کا علم ہونا ضروری ہے۔ جس تہذیب میں وہ نمودار ہوئے وہ تہذیب اپنے اصول، اقدار اور اپنی بناوٹ میں کیا تھی، یہ جانے بغیر حالی کو سمجھنے کی کوئی کوشش کارگر اور کامیاب نہیں ہوسکتی۔ حالی کی شخصیت کچھ ایسی ہے جو تہذیب کے ضمیر میں تشکیل پاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ خود حالی کیا ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت کس وجہ سے پیدا ہوئی۔ اور کسی قدر یہ کہ ان کی شخصیت کی ایسی بناوٹ کیا تھی جس سے ان بڑے کاموں کا عمل میں آنا ممکن ہوا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

شاعروں میں شخصیت کی تشکیل کے اخلاقی عناصر ڈھونڈنا ایک غیر موجود چیز کو ڈھونڈنے کی ضد کر لینے جیسا ہے۔ لیکن انہی شاعروں میں کچھ ایسی شخصتیں بھی پیدا ہوئی ہیں جن میں اخلاقی اور شخصی کمالات مجسم نظر آتے ہیں۔ جو شخصیت کے کسی بھی اخلاقی معیار پر خودبخود پورا اترنے کی ضمانت دیتے ہیں بلکہ انہیں دیکھ کر کچھ نئے اخلاقی عناصر اور مراتب سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ تو حالی شاعروں میں ان چند گنی چنی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن میں اخلاق اپنے کتابی معیار کے مطابق مجسم ہو گیا تھا۔ بلکہ ان کی شخصیت سے ذرا سا قرب اختیار کر کے دیکھا جائے تو آدمی اپنے تصور اخلاق میں کچھ ضروری عناصر کا اضافہ کرنے پر مجبور اور مائل ہو جاتا ہے۔ حالی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شاعر یا مفکر یا ناقد یا سوانح نگار کی حیثیت سے زیادہ مکمل تھے یا شخصیت کی اصلی اخلاقی تشکیل جس معیار پہ ہوتی ہے، اس اعتبار سے ان کی شخصیت ان کی دیگر تمام حیثیتوں سے زیادہ کامل تھی، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

دو تین شخصتیں مجھے پرانے لوگوں میں پرانے شاعروں میں ایسی نظر آتی ہیں جو آدمی کو اخلاقی حقائق کا بھی تجربہ کروا دیتی ہیں۔ اخلاق نام ہوتا ہے متعین صورتوں اور مستقل حقیقتوں کا۔ تو وہ شخصتیں صرف اخلاق کی متعین صورتوں کا ہی مشاہدہ نہیں کرواتیں بلکہ ان صورتوں کو قائم کرنے کی وجہ بننے والے حقائق کو بھی تجربہ کروا دیتی ہیں۔ ان میں جو دو تین شخصتیں ہیں، اچھا ہے میں دو اور کا بھی نام لے لوں۔ وہ دونوں شخصتیں حالی کے بعد کی ہیں اور ہماری دیکھی ہوئی نہیں ہیں: مولانا حالی، مولانا حسرت موہانی، اور جگر مرادآبادی۔ یہ تین لوگ ایسے ہیں۔ جن کا انسان ہونا ان کی تمام شناختوں پر غالب یا جن کی شخصیت کا اخلاقی جوہر ان کی ذات کے تخلیقی عناصر پر حاوی ہے۔ مضبوط شخصیت اسی کو کہتے ہیں کہ جس کا اخلاقی جوہر اس کی شخصیت کی تعمیر کرنے والے دیگر ضروری عناصر پر حاوی ہو، متصرف ہو، حاکم ہو اور انہیں راستہ دیکھانے والا ہو۔ کیونکہ اخلاقی شعور اگر مرکزی حیثیت میں رہ کر کام نہ کرے تو علم اور مقصد علم کے درمیان تعلق کا کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔ حسرت موہانی سے پتہ چلتا ہے کہ خیر کتنا مضبوط ہوتا ہے۔ جگر مرادآبادی سے پتہ چلتا ہے کہ خیر کتنا معصوم ہوتا ہے اور حالی سے پتہ چلتا ہے کہ خیر پورا کا پورا، اپنی عصمت کے ساتھ اپنی مضبوطی کے ساتھ توازن کے ساتھ اور تواضع کے ساتھ، ہے کیا!

یعنی خیر انسان میں تواضع اور انکسار کے رویئے کے بغیر منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ تو اگر حالی کو یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا صاحب کمال آدمی تھا جو انکسار اور تواضع کے گارے سے بنا ہوا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ انکسار اور تواضع کو احوالی سطح پر عملی درجے پر اور ذہنی اقلیم میں یکجان رکھنا یہ انسانی شخصیتوں کے لیے سب سے مشکل کام ہے۔ بڑی شخصیت کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کے آئیڈیل ہی اس کے احوال کو پیدا کریں۔ اس کے آئیڈیلز ہی اس سے اعمال کا صدور کروائیں۔ تو حالی وہ تھے کہ خیر جن کا خیال تھا خیر جن کا قال تھا، خیر جن کا حال تھا اور خیر ہی ان کا مدار اعمال تھا۔ تو یہ جو نادانستہ قافیہ بندی ہوگئی، اسے نظر انداز کر دیجئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حالی گویا خیر مجسم تھے۔ کمال رکھتے ہوئے خود کو کمال سے خالی یقین کرنا یہ کسی معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یعنی جس کے لیے اس کا ہر کمال ایک غلط مفروضہ اور ہر فرضی عیب حقیقت ہو، اس شخصیت سے بڑی شخصیت کا امکان بھی نہیں ہے۔ تو حالی کی یہ عظمت جو ہے، یعنی کہ حالی کی یہ شخصی بڑائی جو ہے، جو میں اپنے تجربے سے کہوں، تو دل کو پگھلا دیتی ہے، یہ مجبور

کرتی ہے، اور آدمی خوشی سے اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں کوئی بہت تند تنقیدی رویہ اختیار نہ کرے۔

حالی کے بارے میں جن باتوں کے صحیح اور غلط ہونے پر ہم لڑ رہے ہیں، حالی کو دیکھ لینے سے جو حقیقتیں ہم تک منتقل ہو جاتی ہیں، ان باتوں کے صحیح اور غلط ہونے کا درجہ ان حقیقتوں سے کہیں کم تر ہے۔ حالی وہ آدمی ہیں کہ جن کی شخصیت کو جانے بغیر ان کی فکر کے بنیادی مادے کا فہم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی فکر، چاہے وہ شعری ہو، چاہے وہ تہذیبی ہو، چاہے وہ تنقیدی ہو ان سب کی تہہ میں ان کی شخصیت کارفرما ہے۔ یہ ان کی شخصیت کے مختلف جہتوں کے مظاہر ہیں۔ تو حالی اصلاً ان مظاہر سے پوری طرح نہیں پرکھے جائیں گے۔ یہ کہنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ میں ایک ایسے اسکول سے تعلق رکھتا ہوں جو سرسید اور حالی وغیرہ کا مخالف ہے۔ ظاہر ہے اس سکول سے تعلق رکھتا ہوں تو مخالف ہونے کے تمام دلائل بھی رٹے ہوئے ہیں۔ اور ان دلائل کا مناظراتی انداز سے دفاع کرنا بھی سیکھا ہوا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے کہ حالی کا جب نام آتا ہے تو ان پر اعتراض ایک اخلاقی پستی لگنے لگتی ہے۔ تو آدمی کو علمی صحت کے لیے اخلاقی پستی میں مبتلا ہونا گوارہ نہیں کرنا چاہیے۔ حالی کا جب نام آجائے سر جھک جاتا ہے۔ سرسید پر میں کچھ تنقید بلا تکلف کر سکتا ہوں۔ سرسید اسکول کے دیگر ترجمانوں کے کام پر تند تنقید بھی بغیر کسی احساس جرم کے کر سکتا ہوں۔ لیکن حالی کا جب نام آتا ہے تو حالی کا مخالف بننے کی اخلاقی جرات نہیں کی جا سکتی اور نہ ہونی چاہیے۔ یہ بات ادب وغیرہ یا تہذیب کے نفسیات کے کسی اوسط طالب علم کی طرح مجھے بھی پتا ہے کہ حالی کے جو بعض خیالات ہیں تبدیلی کے متعلق، ان کے بعض تہذیبی نظریات جو مغرب کے زیر اثر ان کے یہاں مسلمات کا درجہ اختیار کر گئے ہیں، ان سب میں بہت بڑے بڑے خلا ہیں۔ ان سب کو کسی اعتبار سے بے بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ حالی کے تقریباً تمام نظریات میں گہرائی کی کمی کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب ہو سکتا ہے۔ لیکن حالی کی بات کی تاثیر ایسی ہے کہ وہ اس بات میں موجود ضرر کو سر اٹھانے نہیں دیتی۔ اردو کی حد تک مولانا الطاف حسین حالی وہ واحد ناقد یا مفکر ہیں جو، جرات کر کے کہہ رہا ہوں، کہ جو مضر اور غلط فکر کا پرچار کر رہے ہیں، دس فقروں میں، لیکن اللہ نے ان کی شخصیت کی تاثیر کو یا ان کی شخصیت کی حفاظت کے نظام کو اتنا پختہ بنایا ہوا ہے کہ ان کی غلط فکر اور مضر تصور پر مبنی بیان بھی قاری پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالتا۔ قاری ان کے تہہ نشین ضرر سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو حالی کے بارے میں، جیسے یہ ایک قوی گمان پیدا کرتی ہے، کہ ان کی شخصیت میں کوئی تقدس والا عنصر بھی شامل ہے کہ جو ان کے خیالات کی غلطی کو پھیلنے نہیں دیتا۔ آپ غور کیجیے کہ ہم اپنی تہذیب میں مغرب کے ناروا تسلط کا جو نوحہ بھی پڑھیں، اس کی جتنی فہرستیں بھی بتائیں، ان کی ذمہ داریاں سرسید پر تو بہت آسانی سے ڈالی جا سکتی ہیں اور انہیں سرسید کی تحریروں سے نکلتا ہوا دیکھایا جا سکتا ہے۔ لیکن سرسید کے سکول کے اہم ترین رکن کی حیثیت سے حالی کی کسی تحریر سے، کسی گمراہی کے تہذیبی ضرر کا پھیلنا کسی پہلو سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور کسی پہلو سے نہیں دکھایا جا سکتا۔ اب یہ ایک عجیب وغریب مظہر ہے ناں کہ فکر سرسید ہی کی ہے لیکن اس فکر کی ترجمانی ایک ایسی شخصیت کر رہی ہے جس میں اول تو اس فکر میں ضرر کے بہت سے پہلو خود ہی سنسر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ضرر کے کچھ پہلو ان کے بیان میں آ بھی جاتے ہیں تو لگتا ہے کہ خدا نے کوئی ایسا نظام بنایا ہوا ہے کہ حالی کی غلطی کو ذاتی ہی رہنے دے گا متعدی نہیں بننے دے گا۔ تو یہ جو ہے مطلب میرے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے کہ مولانا حالی کے بارے میں سوچتے ہوئے یا انہیں بڑھتے ہوئے ایک جذبے اور رقت

سے فاصلہ رکھ سکوں۔

اب ہم ذرا ان کے کارنامے گنتے ہیں۔ انسانی شعور کی کچھ فیکلٹیز ہیں جو ہر ایک میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں تین سب سے زیادہ عمل میں آنے والی فیکلٹیز ہیں: اخلاقی شعور، جمالیاتی شعور اور عقلی شعور۔

اگر جمالیاتی شعور کی سرگرمی کا رخ عقل کے مخالف رخ پر ہو جائے تو شعور کی مجموعی فضا گدلی یا آلودہ نہیں ہوتی۔ اسی طرح اخلاقی شعور اگر جمالیاتی شعور سے تصادم کی حالت میں اپنے اصول کی بنیاد پر چلا جائے تو اس اندرونی تصادم کے نتیجے میں بھی شعور کا جو شفاف پانی ہے اس میں کوئی آمیزش داخل نہیں ہوتی۔ لیکن ایک صورت ایسی ہے کہ اس سے اگر شعور کے اندر تضاد و جدل پیدا ہو جاتے تو شعور کے مجموعی احوال بگڑ جاتے ہیں۔ یعنی عقلی احوال، جمالیاتی احوال، اخلاقی احوال یہ سب بگڑ جاتے ہیں اور وہ ہے جمالیاتی شعور کا اپنی طرف سے اخلاقی شعور سے بغاوت۔ اگر جمالیاتی شعور اپنے اصول میں اخلاقی شعور کی اقدار سے متصادم ہو جائے گا تو یہ تصادم کی وہ صورت ہے جو مجموعی شعور کی ساری فضا میں اندھیرا پھیلا دے گی، دھواں پھیلا دے گی۔ اس سے شعور کی مجموعی قوت متاثر ہو جائے گی۔ تو جو بھی بڑے لوگ ہوتے ہیں جمالیاتی روایتوں میں، شاعری وغیرہ کی روایتوں میں، وہ اس بات کا اہتمام رکھتے ہیں یا ان کے یہاں اس چیز کا اہتمام نظر آتا ہے کہ جمالیاتی مقاصد اخلاقی اصول سے ٹکراؤ کی حالت میں نہ ہوں کیونکہ جیسے ہی یہ ٹکراؤ پیدا ہوگا جمالیاتی شعور بھی مرجھانے لگے گا اور اخلاقی شعور بھی گویا شعور کی مجموعی دنیا سے بے دخل ہو جائے گا۔ اس بات کو شعور نہ قبول کرسکتا نہ برداشت کرسکتا ہے۔ تو حالی اس پہلو سے ہماری اس درخشاں روایت کے کامل وارث اور ترجمان ہیں۔ شروع ہی سے ان کی تخلیقی اور جمالیاتی زندگی میں دو مرحلے آئے، ان کی طرف ابھی بعد میں آتے ہیں، لیکن یہ کہ شروع سے ہی حالی کی شاعری میں جمالیاتی اور اخلاقی شعور جڑواں بھائیوں کی طرح متفق نظر آتے ہیں۔ یہ جو سطح ہے، ایک ایسی سطحِ جمال، جو ہمارے مطالباتِ خیر کی بھی تسکین کرتی رہے، یہ کسی بہت زیادہ دور تک دیکھنے والی آنکھ کو ہی میسر آتی ہے۔ تو حالی کا پہلا کارنامہ جو ان کو جمالیاتی شعور کی تاریخ میں بھی ایک بڑے آدمی کی حیثیت دلواتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے جمالیاتی تسکین کے نظام کو اخلاقی اضطراب کا سبب کبھی نہیں بننے دیا، انہوں نے جمالیاتی شعور کے تمام حاصلات کو اخلاقی شعور کی تسکین کا ذریعہ بنانے میں مکمل کامیابی حاصل کی ہے۔

اب آپ سوچیں کہ کسی کو ایسی آنکھ میسر آجائے کہ وہ جس منظر سے محظوظ ہو، اس منظر سے محظوظ ہونے کا لمس، اس کے اخلاقی شعور کو بھی محسوس ہوتا ہو تو یہ کتنی بڑی بات ہے۔ یہ آنکھ کسی کسی کو میسر آتی ہے کہ وہ صورت کو خیر سے جوڑے رکھے۔ دیکھنا خیر سے جڑا رہے۔ محسوسات میں ایک اخلاقی وحدت پیدا ہو جائے۔ اس شخصیت سے بڑی شخصیت کیا ہوگی کہ جس کے محسوسات میں ایک اخلاقی وحدت پیدا ہو جائے۔ ہم مولانا حالی کے بارے فخر سے اعتماد سے ایک بات کہہ سکتے ہیں کہ ان کے تمام ناقدین کے مقابلے میں انہیں انسان ہونے کے اس شرف تک جیسی رسائی تھی وہ ان کے کسی ناقد کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ انکے محسوسات کا سارا سسٹم ایسا تھا کہ وہ اخلاقی مرکز کے گرد دائرہ بنا دیتا ہے۔ تو یہ حالی کا ایک کارنامہ اور ایک کمال ہے۔

دوسرا یہ کہ حالی تاریخ کے جس موڑ پر تھے وہاں مسلمانوں کو دو سوالات درپیش تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ ہم جو کبھی غالب اور

حاکم ہوا کرتے تھے، اس غلبہ وحکومت کو بحال کرنے کے راستے ڈھونڈیں۔ دوسرا رویہ یہ تھا کہ گزری ہوئی حکومت اور غلبے کی بحالی کی کوشش تب تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ہم اپنی تہذیبی بیماریوں کا علاج نہیں کر لیتے۔ جب تک اپنے حال کی اصلاح نہیں کریں گے اس وقت تک ہم اپنے کسی تہذیبی مقصود کی طرف پیش رفت کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ یعنی غلام یہ ضد کرلیں کہ مجھے بدلے بغیر میرے سر پہ تاج بادشاہی سجا دو۔ تو یہ ضد چاہے کسی معنی میں درست بھی ہو لیکن یہ ضد پوری نہیں کی جاسکتی۔ تو حالی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ پہلے غلام ہونے کی پوزیشن سے ہٹو پھر کوشش کرکے اپنا تاج شاہی چھین لینا لیکن پہلے اپنی اس تہذیبی پستی سے نکلو جو غلامی کی وجہ سے یا تو طاری ہوئی ہے یا غلامی کا سبب بنی ہے۔ اس میں یہ وہ مرحلہ ہے مطلب حالی دوسرے رویے سے تعلق رکھتے تھے جو یہ کہتے تھے کہ ہمارے زوال کا اصل سبب سیاسی نہیں ہے علمی اور تہذیبی ہے۔ ہمارے زوال کی یہ تشخیص غلط ہے کہ پہلے حاکم تھے اور اب محکوم ہوگئے۔ بلکہ صحیح تشخیص یہ ہے۔ کہ ہماری تہذیب میں کچھ ایسے امراض پیدا ہوگئے جس کی وجہ سے ہم انسان ہونے کی شرائط سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یعنی ہمارے یہاں انسان ہونے کی سطح گرتی جا رہی ہے۔ تو حالی اس نقطہ نظر کے تھے اور اس نقطہ نظر میں بے شمار خامیاں ہیں پہلے نقطہ نظر کی طرح۔ لیکن ان کے باوجود ان کا اخلاص اور ان کا خلوص یہ تھا کہ تمام تر مغرب پسندی اور مغرب کو تہذیبی آئیڈیل بنا لینے کے رویے کے باوجود اس معاملے میں حالی کی فکر کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس کو قبول کرکے ہم مغرب کی ذہنی اور تہذیبی غلامی میں جانے سے بچ نہ سکیں۔ یہ بات سرسید کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ سرسید کا بیانیہ ایسا ہے جو مغرب کی غلامی کا طوق پہنے بغیر عمل میں نہیں آسکتا۔ لیکن حالی نے سرسید کے بڑے بیانیوں میں چند بنیادی تبدیلیاں کرکے انہیں ہماری دینی اور تہذیبی دونوں ضرورتوں اور دونوں سطحوں سے مانوس کروایا۔ سرسید کا افراط وتفریط کا رویہ حالی کے ہاں سرے سے نہیں ہے۔ حالی یہ چاہتے تھے کہ تہذیب میں علم اور اخلاق کی قدروں سے زندگی میں مضبوطی آتی ہے اور تہذیب کے اسبابِ بقا فراہم ہوتے ہیں۔ یعنی کسی تہذیب کو اگر اپنے آئیڈیلز کے ساتھ برقرار رہنا ہے۔ تو ضروری ہے کہ وہ علمی اور اخلاقی ترقی اپنے اصول علم اور اپنے اصول اخلاق پر کرے۔ مگر حالی کے یہاں اس سطح پر تھوڑا سا عدم توازن پیدا ہوگیا ہے۔ اور وہ پیدا ہونے کا ایک سمجھ میں آسکنے والا سبب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ حالی نے تہذیب کے اخلاقی اصول پر جو زور دیا ہے وہ ہماری ہی روایت کے مسلمات میں رہتے ہوئے دیا ہے۔ حالی نے مغرب کو اخلاقی ماڈل بنانے کی کوشش نہیں کی سرسید کی طرح۔ لیکن ان کے یہاں مسئلہ ہوتا ہے علم کی قدر کا۔ یہ مغرب کو علم کی قدر کا واحد وارث مانتے تھے۔ مطلب تہذیب کی بقاء کی جو دوسری سب سے بڑی ضرورت ہے یعنی علم، تو اس میں حالی مکمل طور پر مغرب سے گویا مسحور ہو چکے تھے اور وہ پوری شدت سے یہ چاہتے تھے کہ ہم تہذیب کو زندہ کر دینے والی علمی روایت کا احیا نہ کریں بلکہ اس روایت کو مغرب سے نقل کریں۔ اس روایت کو مغرب سے منتقل کریں اپنے اندر۔ تو اس میں تھوڑا سا عدم توازن پیدا ہوگیا ان کی شدت اخلاص کی وجہ سے، ان کی بے قراری کی وجہ سے۔ اور اس صورت حال میں رکھ کر اپنے آپ کو دیکھ لیں یا آج اپنے آپ کو دیکھ لیں۔ تو ہم بھی اس بات کو ماننے پر مجبور ہیں کہ اگر ہمیں دنیا میں ایک کامیاب قوم کی طرح رہنا ہے تو مغرب پر توجہ بڑھا کر ہی ہم کامیاب قوم بننے کا نسخہ حاصل کرسکیں گے۔ یہ بات گویا غیر شعوری طور پر ہمیں بھی تسلیم ہے۔ تو حالی سے بہرحال اس کے اظہار میں، کچھ تھوڑی اونچ نیچ ہوگئی۔ لیکن یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بڑے شاعروں کے مزاج اور عادت سے ہٹ کر تمام جمالیاتی سرگرمیوں کو اخلاقی اور تہذیبی مقاصد میں صرف کرنے

کی کوشش کی۔ کیا وہ بڑا ذہن نہیں ہوگا، کیا وہ شاعر بڑا دماغ نہیں ہوگا جو اپنے سارے اثاثۂ جمال کو اپنی تہذیب کی اخلاق اور ذہنی پرداخت میں صرف کرنے پر کام آتا ہو؟ کیا وہ بڑا آدمی نہیں ہوگا جو جمالیاتی شعور کو عقلی شعور تک سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کر رہا ہو؟ یہ قدم بہت بڑا ہے۔ یہ تصور ہی بہت بڑا ہے۔ حالی کے تمام کام جن تصورات سے پیدا ہوئے ہیں وہ تصورات چھوٹے دماغ میں جنم نہیں لے سکتے۔ حالی کا ہر تصور بڑے ذہن میں پیدا ہونے والا تصور ہے۔ بڑی طبیعت میں راسخ ہو جانے والا حال ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بڑے تصور کے بننے میں معلومات کی کمی بعض مرتبہ ان کے یہاں حارج ہوئی ہے۔ وہ مغرب کو جانتے نہیں تھے مغرب کی خبر رکھتے تھے۔ مغرب کو اس زبان اور اس کی تہذیب کے ساتھ سمجھتے نہیں تھے۔ تو اس کی وجہ سے ان کے یہاں کچھ اونچ نیچ ضرور پیدا ہوئی ہے۔ مغرب فہمی میں ان پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کیا مغرب فہمی میں کمزوری کے باوجود انہوں نے اپنی تہذیب کے مکینکس کو بدل سکنے والے ذہنی تصورات فراہم نہیں کیے؟ مطلب یہ مانا کہ حالی مغرب کو نہیں جانتے تھے۔ حالی مغرب کو اتنا بھی نہیں جانتے تھے۔ جتنا آج کا ایک عام تعلیم یافتہ آدمی جانتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود مغرب کو سمجھنے میں بالکل بچگانہ غلطیوں کے ارتکاب کے باوجود انہوں نے اپنی تہذیب ہی میں پر پا ہو جانے والے تخریب کے یقینی عمل کو روکنے کے لیے جو راستے اور تصورات وضع کیے وہ بڑے ذہن اور بڑے ارادے ہی میں آسکتے ہیں۔ ہم علوم کو ان کی صحت سے نہیں جانتے۔ اگر علم کے ساتھ اس کا صحیح ہونا لازم ہو جائے تو آج افلاطون کو بڑا کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آج فیثا غورث کو عظیم ماننے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی تصور صحیح ہو، یا غلط، اس کی تعمیر کا عمل چھوٹی کوٹھڑی میں ہوا ہے یا پورے آفاق میں ہوا ہے۔ یعنی اس کی تعمیر کا عمل چھوٹے دماغ میں ہوا ہے یا بڑے ذہن میں ہوا ہے۔ تو حالی کی غلطیاں اپنی جگہ لیکن ان کے جو بنیادی تصورات ہیں وہ گویا ایک تہذیبی ذہن میں جگہ بنا سکنے والے تصورات ہیں۔ اس شخص کے دماغ میں پیدا ہونے والے تصورات اتنا وزن اور اتنی حقیقت رکھتے ہیں کہ وہ تہذیبی دماغ میں راسخ تصورات کی جگہ لے لیں تو تعجب نہیں ہے۔

جو آدمی اپنے تصور کی اتنی زیادہ تعمیم کر سکے اتنا غیر شخصی کر سکے تو وہ یقیناً بڑے ذہن کا اور بڑے ارادے کا آدمی ہوگا۔

تیسرا جو ان کا کارنامہ ہے جس کی تصدیق زیادہ آسانی سے کی جاسکتی ہے (اچھا بھائی وقت کی کمی کا جو اعلان بار بار ہوا ہے ناں تو اس کا ایک نفسیاتی اثر مجھ پر بھی ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ

حالی اردو شعر و ادب کی تاریخ میں سب سے بڑی تبدیلی پیدا کرنے کے بانی ہیں۔ ادب میں حالی سے زیادہ موثر شخصیت کوئی نہیں ہے۔ حالی سے بڑی شخصیت تو ہے اقبال۔ لیکن حالی سے زیادہ موثر، اثر چھوڑنے والی، دبستان بنا دینے والی شخصیت کوئی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر حالی کی ادبی تھیوری سامنے نہ آتی۔ حالی کا ادبی مشن اگر وجود نہ پاتا تو اقبال پیدا نہ ہوتے۔ اقبال حالی کے تصور ادب کی صحت کے سب سے بڑے نمائندے ہیں، حالی سے بھی بڑے۔ لیکن یہ کہ حالی کا نظریۂ شعر اقبال کے اسباب پیدائش میں ایک بڑا سبب ہے۔ اور اقبال کے شاعرانہ مسائل و مضامین جو اصل میں اقبال سے مخصوص ہیں، ان شاعرانہ مضامین کی پیدائش میں بھی حالی کا ہاتھ ہے۔ یعنی شاعری برائے مقصد۔ یہ جو نظریہ تھا حالی کا، اس نے اردو ادب کی تاریخ میں سب سے وسیع نتائج پیدا

کئے ہیں۔حالی کا نظریہ شعر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انسان کی جمالیاتی ضرورتیں اس کی تہذیبی اور اخلاقی ضرورتوں سے مقدم نہیں ہیں بلکہ ان کے تابع ہیں۔اب یہ بات ایسی ہے کہ جس کا فلسفیانہ سطح پر بھی دفاع کیا جاسکتا ہے۔اور ادبی معیار کے طور پر بھی اس کا پرچار کیا جاسکتا ہے تو حالی کی تھیوری ہے کہ انسان کے جمالیاتی مطالبات اگر علمی اور اخلاقی شعور کو شامل کیے بغیر پورے ہوں گے تو وہ ناقص ہیں۔

انسان کے جمالیاتی مفادات کی وہ اہمیت نہیں ہے کہ وہ تہذیب کا زندگی کا آخری مقصد بن کر رہ جائیں۔مقصد جمالیاتی شعور فراہم نہیں کرتا۔ جمالیاتی شعور کا اصل کام ہے طے شدہ مقصد کی کشش کو اپنے اندر زندہ رکھنا، تنوع کے ساتھ شادابی کے ساتھ سیرابی کے ساتھ۔یعنی جمالیاتی شعور کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ مسلمات کو اور مقاصد کو سرشاری عطا کر دے۔اس نظریے کا دفاع میں سطح پہ کرسکتا ہوں، ہر تھیوری میں کہا جاسکتا ہے۔جمالیاتی شعور کی ساخت ایسی ہے کہ وہ اس کام پر مامور ہے کہ وہ اخلاقی مقاصد، علمی مقاصد، تہذیبی مقاصد کو میرے نفس کے لیے میری طبیعت کے لیے میرے ارادے اور ذہن کے لیے پُرکشش بنائے اور تر و تازہ رکھے۔اردو کی شعری روایت میں حالی پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اس انتہائی بڑے اصول کا ترجمان بن کر دکھایا اور صرف ترجمانی نہیں کی بلکہ اسکے بڑے بڑے نتائج بھی ہمیں پیدا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اور سب سے بڑا نتیجہ خود اقبال ہیں۔ ٹھیک ہے ناں۔تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔(ابھی کچھ دیر قبل عزیز ابن الحسن صاحب فرما رہے تھے کہ میں تمہیں کچھ مضامین بتا دیتا ہوں تاکہ بات کرنا آسان ہو جائے۔ظاہر ہے ہر چیز تو ذہن میں نہیں رہتی۔تو اس میں ایک مضمون یہ تھا کہ آرٹ اور اخلاق، تو اسی کو ذہن میں رکھ کر ان کی اس بات کو یوں عرض کر رہا ہوں) کہ اگر کبھی تہذیبی اور نفسیاتی سطح پر فن اور اخلاق (یعنی جس کو میں نے کہا جمالیاتی شعور اور اخلاقی شعور) میں تصادم کی صورت حال پیدا ہو جائے تو فرد کی بقاء بھی اور قوم اور تہذیب کی بقاء بھی مبنی ہے اس فیصلہ پر کہ اخلاقی شعور کو برتری دلوائی جائے۔اخلاقی شعور کو سبقت اور مرکزیت دی جائے۔حالی اخلاق اور فن میں تصادم پیدا ہو جانے والی صورت حال میں پیدا ہوئے تھے۔اور اس صورت حال کے مطابق انہوں نے بالکل درست فیصلہ کیا کہ فن کو اخلاق کے تابع ہونا چاہیے۔ جمالیاتی سرگرمیوں کو تہذیبی مقاصد کے تابع ہونا چاہیے۔ جمالیاتی سرگرمیاں تہذیبی مقاصد کو تخلیق نہیں کرتیں بلکہ ان کا اتباع کرتی ہیں۔اس تصادم کی صورت حال میں جس میں حالی تھے ان کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔اور ان کے اس فیصلے کے دو اجزاء ہیں۔مطلب جو انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ شاعری کا کوئی مقصد ہونا چاہیے۔شاعری کا مقصد محض ایک طبعی اور مفروضاتی تسکین نہیں ہونا چاہیے، محض اتنا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ کہ اس شاعری کی تاثیر کو تہذیب کی تکمیل کے عمل میں کام کرتے ہوئے دیکھائی دینا چاہیے۔اس میں جو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی زبان کو، اپنی زبان کے ساتھ اپنے تعلق کو زیادہ تخلیقی اور تحقیقی بناؤ اور اپنے حالات کے تقاضوں کو سمجھو۔یہ میں تقریباً حالی کے لفظوں میں عرض کر رہا ہوں کہ زبان کے ساتھ تعلق آرائشی نہ رکھو اور اپنے حالات سے تعلق آدرشی نہ رکھو۔ان کا ''مقدمہ شعر و شاعری'' جو اردو تنقید کا سب سے بڑا ڈسکورس ہے۔مطلب شاعری کی تنقید میں ''مقدمہ شعر و شاعری'' کسی اور پہلو سے تو کسی تنقید مضمون یا کتاب سے کم ہوسکتا ہے لیکن اپنی اہمیت اور تاثیر کے اعتبار سے اردو تنقید کا پورا ذخیرہ اس کے سامنے گونگا ہے۔تو مقدمہ شعر و شاعری کو ہم کہیں کہ پہلی شعری تھیوری ہے جو لاگو ہوئی

ہے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اگر تنقید کسی ڈسکورس میں ڈھلنے میں کامیاب ہوئی ہے تو وہ ڈسکورس ''مقدمہ شعر وشاعری'' ہے۔ وہ ذرا پڑھیے اور دیکھئے کہ کتنا بڑا ادبی ذہن بھی تھا اور اگر اس کی معلومات بھی کچھ بڑھی ہوئی ہوتیں تو کیا کہنے تھے۔

چوتھی بات یہ کہ شخصیت کا یا کسی بڑے آدمی کی پہچان کا ایک وصف، خواہ اضافی سہی لیکن یہ ہوتا ہے کہ اس میں جامعیت کتنی ہے یا جامعیت اگر مشکل ہو ڈھونڈنا تو دیکھیں کہ وہ اپنی ہر شناخت میں کامل بننے میں کامیاب ہوا یا نہیں۔ کسی بھی بڑے آدمی کو دیکھتے ہوئے اس انداز نظر کو کام میں لانا مفید ہوتا ہے کہ یہ بڑا آدمی مختلف شعبوں میں کام کرتا رہا ہے۔ تو اس کی بڑائی ان تمام شعبوں میں یکساں ہے یا نہیں یعنی یہ تمام شعبوں میں یکساں طور پر بڑا ہے یا نہیں۔ اگر ہمیں نظر یہ آ جائے کہ ایک آدمی نے چار چار شعبوں میں کام کیا ہے اور ہر شعبے میں کام کرنے والوں کی صف اول میں ہے تو یہ اس کی بڑائی کے لیے گویا ہمیں ایک تصدیق فراہم کر دیتی ہے۔ حالی کو اس نظر سے بھی دیکھ لیں کہ وہ شاعر کی حیثیت سے بہت اچھے شاعر ہیں اپنے دونوں ادوار میں۔ وہ نقاد کی حیثیت سے اردو تنقید کی صف اول میں ہیں۔ سوانح نگاری انہوں نے کی تو سوانح نگاری کا پورا سکول بنا کے رکھ دیا۔ یعنی سوانح نگاری کو اخبار نویسی کی سطح سے بلند کر دیا۔ شخصیت کو اس کے شعور کے مراحل کے ساتھ انہوں نے اپنا موضوع بنایا۔ سوانح نگاری میں اگر یہ بھی جوش میں کہہ دیا جائے کہ اردو کا سب سے بڑا سوانح نگار حالی ہے تو شبلی کی موجودگی میں بھی یہ غلط نہیں ہے۔ تو سوانح نگاری میں بھی وہ ہیں۔ پھر شاعری میں، مطلب روایتی شاعری میں وہ بہت اچھے شاعر تھے، بہت اچھے غزل گو تھے اور جب انہوں نے غیر روایتی شاعری شروع کر دی تو اس کی بھی صف اول میں رہے۔ غرض یہ کہ جن جن جہتوں میں کام کیا ہے ان تمام جہات میں وہ صف اول میں ہیں۔ تو یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اور حالی کو آپ دیکھئے، بڑے آدمی کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس میں ایثار کتنا ہے۔ یعنی کہ بڑی شخصیت ایثار کے وصف سے خالی ہو ہی نہیں سکتی تو اردو شاعری کی تاریخ میں جتنا بڑا ایثار حالی نے کیا ہے اور کسی نے بھی نہیں کیا۔ کسی نے بھی نہیں۔ یعنی دو شاعروں نے ایثار کی حد کر دی ہے۔ ایک حکیم ثنائی جو ظاہر ہے بہت بڑے شاعر تھے اور ایک مولانا الطاف حسین حالی۔ حکیم ثنائی بادشاہوں کی نوابوں کی قصیدہ گوئی کرتے تھے۔ وہ ذریعہ معاش ان کا تھا۔ تو ایک مرتبہ کسی نے غیرت دلائی تو وہ ساری شاعری دریا برد کر کے ایک نئے سرے سے شاعری شروع کی اور وہ فارسی کے سب سے بڑے پانچ شاعروں میں ہیں۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کی سطح بھی کوئی نہیں تھی۔ تو اپنے آپ کو پورا ترک کر دینا اس سے بڑا ایثار کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی اپنے آپ کو ترک کرنے سے بڑا ایثار کیا ہوگا۔ تو حالی غزل گوئی کی پرانی روایت میں رہتے تو اردو کے دس بڑے شاعر میں یقیناً شامل تھے۔ اگر وہ اس روایت میں رہتے کہ

ع کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اس طرح مطلب بہت بڑے بڑے شعر کہہ رکھے ہیں انہوں نے۔ تو اس میں لگے رہتے تو دس بڑے شاعروں میں تھے یا دس بڑے غزل گوؤں میں تھے۔ اور غالب اور شیفتہ ایسے سخن دانوں سے داد لے چکے تھے۔ مطلب ان کے لیے یہ اعتماد رکھنا روا تھا کہ میں اس لائن میں چلتا رہا تو بڑا شاعر بنوں گا۔ بڑے شاعروں اور بڑے ناقدوں سے داد لی انہوں نے اس کے بعد اس کو پوری

طرح ترک کر کے ایک بالکل نیا رنگ اختیار ہی نہیں کیا بلکہ اس کے بانی بن گئے۔ بہت ہی بڑا ایثار ہے۔ تو حالی کو اس ایثار کا بھی صلہ یہ ملا کہ جو دوسری روایت انہوں نے شروع کی اس روایت کے بانی کی حیثیت سے ان کا مرتبہ محفوظ ہے۔ اور صرف بانی ہی نہیں اس روایت میں ہونے والی شاعری کے بہترین نمونوں میں ان کا کلام بھی شامل ہے۔ اب کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ ''مسدس مدوجزر اسلام'' شعری پیمانے پر بھی بڑی نظم نہیں ہے۔ کون ہے جو کہہ سکے کہ ''عرض حالِ مصنف باحضور رحمت اللعلمینؐ'' یہ شعری معیارات پر بھی بڑی نظم نہیں ہے۔ اور کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ حالی کی دو تین نظموں سے زیادہ مقبول نظم کوئی اور نظم ہوئی ہے۔ اقبال کی بھی۔ مطلب حالی کی ''مسدس مدوجزر اسلام''، عرض حال

اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے

اسی طرح ''چپ کی داد'' جو خواتین کے لیے لکھی............ یہ ایک اور پہلو آ گیا حالی کا۔ ''چپ کی داد'' خواتین کے لیے لکھی ہے۔ بیوہ کی مناجات وہ بھی خواتین کے لیے لکھی ہے۔ یہ اردو کی بڑی نظمیں ہیں۔ تو اگر کسی شخص نے چار پانچ ایسی نظمیں ہی تخلیق کر دکھائی ہوں جو اس زبان کی روایت میں بڑی نظموں میں شامل ہونے کی اہلیت رکھتی ہوں تو وہ بڑا شاعر ہے۔ اس کے بڑے شاعر ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اب ذرا پیچیدہ سی بات آئی ہے۔ جمالیاتی شعور میں گراوٹ پیدا ہو جانے کی وجہ سے یا اس وجہ سے بھی کہ ہمارے جمالیاتی شعور کے بگاڑ نے عورت کو صورت تک محدود کر دیا اور اس کے حقائق کو اوجھل، غیر عملی اور غیر تخلیقی بنا دیا۔

تو کیا وہ شخص آپ کا محسن نہیں ہے جو آ کر آدھی تہذیب کو زندگی عطا کرے؟ آدھی تہذیب کے تعطل کو دور کر دے؟ عورت کا غلط تصور قائم ہونا گویا آدھی تہذیب کا فنا ہونا ہے، گویا تہذیب میں مسخ ہونے کے عمل کو شروع کرنا ہے۔ کسی تہذیب میں مسخ ہونے کی اس سے بڑی علامت نہیں ہو سکتی کہ اس کا تصور زن مسخ ہو چکا ہو۔ ٹھیک ہے ناں؟ تو کیا حالی کا یہ کم احسان ہے کہ انہوں نے عورت کو اس کی روایتی قدر پر رکھتے ہوئے ایک انسانی برابری، بلکہ برابری سے زیادہ یہ کہ مرد سے زیادہ ضروری وجود ہونا ثابت کیا ہے؟ یہ حالی کا کارنامہ ہے کہ اس نے تہذیب کا ایک ایسا منظر پیش کیا جسمیں میں عورت مرد سے کم تر نہیں بلکہ مرد سے زیادہ ضروری ہے۔ ''چپ کی داد'' پڑھ لیجئے تو آپ کو پتہ چل جائے۔ یہ نظم ذرا بلند آواز سے پڑھ لو اور اگر رونا نہ آئے تو پھر سینہ سکین کروانا کہ اندر دل ہے یا نہیں ہے؟ سو مرتبہ بڑھو گے سو مرتبہ ایک نئی حالت گریہ کا انکشاف ہوگا۔ پڑھ کے دیکھ لو۔ سو مرتبہ پڑھو سو احوال گریہ سے گزارے گی یہ نظم۔ تو جو دکھ میں تنوع پیدا کر دے وہ بڑا آدمی ہے۔ سکھ میں رنگا رنگی تو ہوتی ہی ہے۔ وہ ''چپ کی داد'' ہے ناں۔ مشہور ہے۔ اے ماؤں بہنو، بیٹیو۔ مطلب یہ ایسی نظم ہے جو آدمی کوشش کرتا ہے کہ تنہائی میں پڑھے کیونکہ بعض لوگوں کو دوسروں کے سامنے رونا اچھا نہیں لگتا شرم آتی ہے۔ تو یہ وہ نظم ہے کہ تنہائی میں پڑھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ آج بھی، مطلب، فیمنزم کا جو پوسٹ ماڈرن جو تھیم ہے۔ اس کے خلاف سب سے طاقت ور رد اگر کوئی ہمارے پاس ہے تو وہ ''چپ کی داد'' ہے۔ آپ کا کوئی جوابی فلسفہ اسے رد نہیں کر سکتا۔ ''چپ کی داد'' کو اپنی تہذیبی شناخت میں ایک حال کے طور پہ سرائیت کر جانے کا موقع دے دو تو فیمنزم کے بیانیے کو ڈھا دینے والا، اس کا اثر قبول نہ کر سکنے والا مزاج پیدا ہو جائے گا۔

اب دل چاہنے لگا ہے کہ کچھ نقائص بیان کریں لیکن وہ میں نہیں کروں گا۔ محاسن تک رکھتے ہیں۔ تو مطلب، حالی محسن ہیں

ہمارے اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دعا کرتے ہیں اور ان کی یہ دعا قبول ہوتی ہے:''یا اللہ میری ذات سے فائدہ پہنچانا میری کسی غلطی سے لوگوں کو نقصان نہ پہنچے دینا''۔ اس دعا کی قبولیت اگر دیکھنی ہو تو مولانا حالی کو دیکھ لو۔ مولانا حالی اور ان کے پیدا کیے ہوئے نتائج کو دیکھ لو تو اب میں بات ختم کرتا ہوں۔ اب کچھ سوال اگر ہو تو کرلیں۔

جی سوال تاکہ یہ بات آگے چلے۔ کسی بھی حوالے سے اس موضوع کے متعلق ہوں سوال۔

ارشد معراج: میرا سوال یہ ہے کہ سرسید تحریک نے کسی بھی حوالے سے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر غور نہیں کیا سوائے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے۔ تو حالی کے ہاں اس کا جواز یا اس کا کوئی نمونہ ان کے کلام کے ذریعے یا ان کی نثری تحریروں کے ذریعے کہیں کوئی ظاہر ہوا ہو۔

احمد جاوید: ہاں یہ میں کہہ نہیں سکتا لیکن میرے مطالعے کی حد تک عورتوں کی تعلیم کے مسئلے پر حالی نے گفتگو نہیں کی لیکن عورتوں کی تربیت کے مسئلے پر ان سے زیادہ گفتگو کسی نے نہیں کی۔ ایسی تربیت جس میں مربی خود عورت بنے۔ ظاہر ہے مجھے بھی تربیت کی ضرورت ہے۔ دوسروں کو بھی ہے۔ تو مرد کی تربیت غیر پر منحصر ہے۔ حالی نے ایک عجیب فضا پیدا کی عورتوں کے اکرام میں۔

کہ تم ہی زیرِ تربیت ہو اور تم ہی مربی ہو

مرد کی تربیت میں اس کے علمی شعور کا آگے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن خواتین کی تربیت میں ان کے اخلاقی شعور کے تقاضوں کو عمل میں لانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ صنفی ایک امتیاز ہے بناوٹ کا۔ تو حالی نے غالباً ہماری تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ تھیم دیا کہ عورت کو چاہیے کہ آپ ہی اپنی مربی بنے۔ آپ ہی اپنی مرشد بنے۔ لیکن تعلیم کا جو مسئلہ ہے ناں اس میں حالی کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں آتی۔ اس کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے۔

ارشد معراج: میں یہ عرض کرنا چاہا رہا ہوں کہ صنفی امتیاز کو سیاسی تربیت اور شعوری تربیت جو خواتین یہاں بیٹھی ہوئی ہیں، باشعور ہیں، پڑھی لکھی ہیں۔ اس امتیاز کی بنا پر شعور کی، ہم انسان کے طور پر تشریح کریں گے یا صنفی امتیاز کے طور پر؟

احمد جاوید: تہذیب صنفی امتیاز کے بغیر بیان نہیں ہوتی۔ شعور میں بھی صنفی امتیاز کارفرما ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ مغرب میں گائنا کریسٹیزم کے نام پر پورا سکول کھل گیا ہے۔ یہ فیمنزم کی واحد پوسٹ ماڈرن تھیوری ہے، جو رواج بنی تو فیمنزم ایک رواج بن چکا ہے۔ صنفی پرسپیکٹیو ایک علمی نظریہ ہے۔ کہ عورت کی Perception اور مرد کی Perception میں کیا امتیازات ہیں۔ اور جولیا کرسٹیویا اس کی چیمپیئن ہیں۔ وہ اگر پڑھنا چاہیں تو پڑھ لیں پوری تصویر کشی ہو جائے گی۔ تو تھوڑا سا آپ اس پہلو سے دیکھیں کہ حالی کے زمانے ہیں مرد اور عورت کا جو متعین کردار تھا حالی کا ذہن بھی کسی نہ کسی طور اس میں مقید رہا۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کمی ہے لیکن ان کے ہاں صنفی امتیاز اس معنی میں بالکل نہیں ہے۔ بلکہ اس کو گرانے کی پہلی کوشش انہوں نے کی ہے۔

ساجد نظامی: آپ نے حالی کے حوالے سے کہا کہ سب سے بڑے سوانح نگار ہیں۔ اگر شبلی کو بطور سوانح نگار دیکھا جائے۔ تو دونوں کے ہاں کیا بڑے اختلاف ہیں۔ سوانح نگاری کے حوالے سے

احمد جاوید: حالی شخصیت کو تہذیب بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ شبلی تہذیب کو شخصیت بنانے کے درپے ہیں۔ یہ ان کے مزاج میں بنیادی فرق ہے۔ اور میری رائے میں حالی سوانح نگاری کے تقاضے صرف ایک پہلو کو چھوڑ کر شبلی سے زیادہ پورے کرتے ہیں۔ وہ پہلو یہ ہے کہ جس کی سوانح لکھتے ہیں، تذکرہ لکھتے ہیں، اس پر تنقیدی نظر نہیں ڈالتے۔ وہ میرے خیال میں سوانح نگار کا کام بھی نہیں ہے کہ وہ تنقیدی نظر ڈالیں تو شبلی تنقیدی نظر ڈالے بغیر رہتے نہیں ہیں۔ چاہے وہ نظر خدا کی طرف ہی کیوں نہ اٹھی ہو۔ اس پھر سے مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ساجد نظامی: سر سوال یہ ہے کہ جو یادگار غالب ہے زیادہ شہرت اسے ملی لیکن سوانح میں جو سب سے بہترین کتاب ہے حالی کی وہ حیات سعدی ہے۔

احمد جاوید: تینوں بہترین ہے۔ ''حیاتِ سعدی'' کو تو اس وجہ سے شہرت نہیں ملی کہ سعدی ہمارے لٹریری ڈس کورس میں موجود نہیں ہیں۔ تو لیکن ''حیات سعدی'' بہترین سوانح ہے۔ اس کی تو شبلی نے بھی تعریف کی ہے کہ وہ جو لکھ گئے ہیں اب میں کیا لکھوں۔ لیکن حالی کی تینوں سوانح بہترین ہیں۔ سرسید کو تاریخ میں باقی رہنے کا ایک سبب حالی کی ''حیات جاوید'' نے بھی فراہم کیا ہے۔ تو اسی طرح ''یادگار غالب'' میں غالب کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کے اکثر عناصر کو تسلسل دینے میں جتنی کامیابی اس کتاب نے حاصل کی ہے۔ غالب پر لکھی گئی کسی دوسری کتاب نے نہیں کی۔

نجیبہ عارف: ابھی آپ نے حالی کے بارے میں یہ فرمایا کہ شاید ان کی یہ دعا قبول ہو گئی تھی کہ ان کی غلطیوں کا اثر دوسرے لوگوں تک نہ پہنچے۔ حالی جس تہذیب کی پیداوار تھے اگرچہ وہ اس تہذیب کا اختتامی دور تھا انحطاط کا زمانہ تھا لیکن اس گری پڑی صورت حال میں بھی اس تہذیب نے حالی جیسی شخصیت کو جنم دیا۔ لیکن حالی نے جس تہذیب کی سفارش کی اور جس کو تقویت دی، اس تہذیب نے پھر کبھی حالی جیسا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔ اس میں کیا آپ اس بارے میں کیا فرمائیں گے؟

احمد جاوید: اس میں ایک تو یہ کہ اس تہذیب نے ،حالی کے اثرات نے، اقبال کو پیدا کیا۔ لیکن یہ کہ حالی کا مثالی تہذیب کا جو خاکہ تھا وہ تھوڑا نقص زدہ تھا۔ وہ انہوں نے کہا ناں کہ

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اب اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

یہ سب بھی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ تہذیب شناسی کے لیے درکار صلاحیتیں تو بہت رکھتے تھے لیکن وسائل نہیں رکھتے تھے تو لہٰذا انہوں نے تہذیبی انحطاط سے نکلنے کے جو راستے بتائے تھے ان میں سے بعض راستے اس لحاظ سے

بھی ادھورے اور ناہموار رہ گئے کہ ان راستوں کو ہموار کرنے والی گاڑی ان کے پاس نہیں تھی۔ مطلب یہ کہ وہ تہذیب کو اندر سے بدلنے کے لیے جو قوتیں درکار ہیں۔ان قوتوں کے حامل کچھ پہلو حالی کے پاس نہیں تھے۔

عاصم بخشی: سر آپ نے کہا تھا کہ آپ صرف محاسن ہی بیان کریں گے اور جس سکول سے آپ کا تعلق ہے وہ گڈبائی ٹو سرسید کہہ چکا ہے۔مگر اس سے یہ لگتا ہے کہ آپ گڈبائی ٹو حالی نہیں کہنا چاہتے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حالی کا ذہن جو کہ بڑا ذہن تھا اپنے زمانے کا ہم آپ کے سکول کو پس منظر میں رکھ کے دیکھیں تو جو مشرقی ذہن ہے۔اس کا مغربی ذہن سے سب سے بڑا فرق شاید یہی نظر آتا ہےعسکری صاحب اور سلیم احمد کے ہاں کہ وہ کمپارٹمنٹ لائزیشن کی نفی کر رہا ہے۔کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حالی جیسا بڑا ذہن وہ بھی مغربی ذہن سے یہ مستعار لے رہا ہے کہ درجہ بندی ہے اور جمالیاتی شعور ہمیشہ اخلاقی شعور کے ماتحت ہونا چاہیے۔تو کیا اس کو ایک غلطی تصور کریں گے کہ اقبال کے ہاں شاید ہمیں اس غلطی میں ترمیم ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ غلطی کم نظر آتی ہے۔ چونکہ مقدمہ شعر وشاعری کو دیکھا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ شاعر کو کسی نہ کسی طرح اخلاقی شعور کے اندر رکھنا ہی اچھے ذہن کی علامت ہے اب ہمارے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ن م راشد ،سلیم احمد کو پورا آدمی نظر آتا ہے تو آپ اس تناظر میں حالی کو کس طرح دیکھیں گے؟

احمد جاوید: پہلے تھوڑا اس تناظر کو درست کریں گے۔جس میں ن م راشد پورا آدمی ہو اقبال آدھا آدمی ہو۔اس تناظر میں ترمیم کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں ہمارے ہاں پورے آدمی کا عہد طفلی حالی ہیں۔ حالی پورے آدمی کا بچپن ہیں۔ اور پورے آدمی کا شباب اقبال ہیں۔

عزیز ابن الحسن: کیا پورے آدمی کا بڑھاپا بھی ہے کہیں؟

احمد جاوید: (ذرا توقف سے) وہ اب دوسروں کو کیا کہیں اپنے آپ ہی کو کہہ دیتے ہیں۔(قہقہے)

قیصر شہزاد: آپ نے انسانی شعور کی بات کی۔عقلی شعور ،اخلاقی شعور اور جمالیاتی شعور کا ذکر کیا تھا۔سوال یہ ہے کہ جمالیاتی شعور کا ارادے کے ساتھ تعلق کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

احمد جاوید: جمالیاتی شعور وہ فیکلٹی ہے جو ارادے کے کم ازکم تابع ہے۔ یعنی انسانی شعور کی بناوٹ ایسی ہے کہ اس میں کچھ قوتیں ارادے سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں جبکہ جمالیاتی شعور کی فیکلٹی ایسی ہے جو ارادے سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی۔تو اسی وجہ سے ہمارے ہاں جیسے شاعری میں آمد کا نظریہ ہے، اس کی فضیلت ہے۔لیکن یہ کہ جمالیاتی شعور ارادے کو متاثر کیسے کرتا ہے۔ اس کو ہم کئی طرح سے دیکھ سکتے ہیں۔ جمالیاتی شعور سے پیدا ہونے والی جو حالتِ سرشاری ہے، جمالیاتی شعور کا سب سے بڑا کام ہے کہ وہ مجھے اپنے کل شعور کے ساتھ ایک حالتِ سرشاری میں رکھے ایک حالت تسکین میں رکھے۔ یہ جمالیاتی شعور کا اصل وظیفہ ہے۔ اور دوسرا اس کا وظیفہ شعور کی جہت سے، یہ ہے کہ یہ غائب کو حاضر رکھنے کی کوشش کرے۔تو یہ دو بڑے وظائف ہیں، بڑے کام ہیں اس شعور کے۔ اور

یہ کام چونکہ اتنے بڑے ہیں، یہ کام اتنے زیادہ ایک علوویت رکھتے ہیں کہ یہ ارادے کے تابع نہیں ہوسکتے۔ ارادے کو اپنے تابع کرنے کی قوت رکھ سکتے ہیں۔ تو جمالیاتی شور کا ارادے سے تعلق یکطرفہ ہے۔ باقی فیکلٹیز کا دوطرفہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ (جمالیاتی شعور) ارادے سے متاثر نہیں ہوتا ارادے کو متاثر کرتا ہے۔ جبکہ عقل ارادے سے متاثر ہوتی بھی ہے اور اسے متاثر کرتی بھی ہے۔

سوال: تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کا جب ہم حالی کے تصور تہذیب سے تجزیہ کریں گے تو کیا ہوگا۔

احمد جاوید: مشترکات پہ زور دیا جائے اختلافات پر اصرار نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ امتیاز کو اختلاف نہ بنایا جائے۔ امتیاز کے جوہر کو جدلیاتی نہ بنایا جائے، ہم آہنگی کا ذریعہ بنایا جائے۔ یہ حالی کے تناظر سے جواب ہے۔

احمد عمار صدیقی: جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مقصدیت ادب کو پھیکا بنا دیتی ہے یہ چیز ہمیں سرسید کے ہاں ملتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن حالی کی شاعری میں یہ رنگ بالکل نہیں ملتا۔ ہم ''مدوجزر اسلام'' کو بھی اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح کوئی اور بنا مقصد چیز لکھی گئی ہو۔ اس کی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے۔

احمد جاوید: اس کی وجہ ان کا جمالیاتی طور پر بھرپور ہونا ہے۔ یعنی کہ یہ شاعری بھی ہے، صرف مقصد کا پرچار نہیں ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ مقصدیت شاعری کو پھیکا بنا دیتی ہے۔ اس کے بہت سارے نمونے ہیں۔ اور اس کے کچھ نمونے حالی کے ہاں بھی ہیں۔ لیکن اگر مقصد جو ہے، وہ سمجھیں کہ صرف میرے ارادے تک محدود نہ ہو بلکہ میری وجودی طلب سے ہم آہنگ ہوجائے تو پھر اس کے نتیجے میں جو بھی شاعری پیدا ہوگئی وہ بڑی ہوگی یا پرلطف ہوگی۔ اب اقبال کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا۔ اقبال اور پابلو نیرودہ کی موجودگی میں جو تقریباً جونیئر سینئر کی حیثیت سے ایک ہی زمانے کے ہیں، ان کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک واضح مقصدیت شاعری کو خراب کرتی ہے۔

فرحانہ شمیم: اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کا آپس میں تعلق جب آپ بتا رہے تھے۔ جب ہم تہذیبی گراوٹ کی بات کرتے ہیں تو آپ کے خیال میں ہم نے ان دونوں کو بالکل الگ کیوں کر دیا ہے؟ اب ہماری تہذیب میں ہم سمجھتے ہیں کہ جمالیاتی اقدار کا فروغ شاید ادیب کا یا شاعر کا کام ہے۔ اور اخلاقی شعور کی اقدار سے روشناس کرانے کا کام شاید اہل مذہب کا یا ان لوگوں کا کام ہے۔ اہل مذہب کے ہاں جمالیات نظر نہیں آتی اور جن کو ہم نے جمالیاتی اقدار کا ذمہ دار بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ اخلاقی ہونا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں یہ کیا ہے۔

احمد جاوید: یہ صورت حال واقعی ہے۔ اور ہمارے استاد کی اصطلاح میں یہ کسریت ہے یا جیسے عاصم بخشی صاحب فرما رہے تھے کہ بالکل جیسے کمپاٹمنٹس میں بٹ جانا ہے۔ ہم نہ وجود کی کلیت کو عمل میں لانے میں کامیاب ہیں نا شعور کی وحدت کو عمل میں لانے میں بامراد ہیں اور یہ کسی تہذیب کے زوال کی سب سے بنیادی وجہ ہوتی ہے۔ کہ اس تہذیب کا شعور کلی حالت میں فنکشنل اور نتیجہ خیز ہونا چاہیے اور اس تہذیب کے اقدار وجود جو ہیں وہ ایک دوسرے سے مربوط حالت میں اثر انگیز ہونے چاہیں۔ جمالیاتی شعور اگر سویا ہوا ہو تو عقل بھی خراٹے لینے لگتی ہے۔ اخلاق بھی مرجھا

جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک میں حالت تسکین میں رہ کر ان چیزوں کو عمل میں نہیں لاؤں گا اس وقت تو بے معنی ہیں سب۔ اندر سے خالی ہیں۔ تو جمالیاتی شعور بہت اہم چیز ہے۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور یہ صرف صنائے بدائع کے سرکس سے نہیں نبھایا جاتا اس کے لیے بڑی چیزیں چاہییں۔

جمیل اصغر جامی: سر پوسٹ ماڈرن ازم میں مقصدیت کو ایک آلہ کار سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مقتدر لوگ مقصدیت کو استعمال کر کے اپنے عزائم کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ان پس پردہ عزائم کی وجہ سے زندگی میں ایک اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ تو اس سلسلے میں حالی ہماری کیا مدد فرماتے ہیں۔ دوسرا میں اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننے میں بھی دلچسپی رکھتا ہوں۔

احمد جاوید: مقصد اگر طاقت مرکز ہو تو یہ جبر بن جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ بات کہنا ٹھیک ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن تہذیبی اور انسانی مقاصد خلقی و فطری ہوتے ہیں۔ تو ان مقاصد کو منہا کر کے نظر انداز کر کے انسان کی حیثیت سے رہنے کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ یہ میں اپنی رائے کے طور پر عرض کر رہا ہوں۔ تو دوسرا یہ کہ یہ جو اکتاہٹ ہے۔ یعنی جس نے دو بڑے سکول پیدا کئے ہیں۔ ایگزیسٹنشل ازم اور تھیٹر آف دی ایبسرڈ، ایگزیسٹنشل ازم اس لیے زیادہ ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہے اس کا پھیلاؤ زیادہ ہے۔ ادب اور فلسفے اور مصوری وغیرہ میں سب میں جاری ہے۔ اور خوب واضح ہے۔ لیکن اس سب میں بھی جو اکتاہٹ، یہی مایۂ شعور ہے۔ یہی مادہ وجود ہے۔ تو اس نے اپنے آپ کو زیادہ نمایاں کر کے تھیٹر آف دی ایبسرڈ میں ظاہر کیا کہ جس میں نہ صرف یہ کہ مقصد کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ مقصد کے تصور سے بھی آزادی چاہیے۔ یعنی جس میں صورت کا بھی انکار ہے۔ معنی کا بھی انکار ہے۔ تو ان کنڈیشنز میں یعنی ایگزیسٹنشل کنڈیشنز میں اور ایبسرڈ کنڈیشنز میں ہم زیادہ دیر نہیں رہ سکتے۔ اس سے ذہن کو لذت فراہم کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے دیکھ ضرور سکتے ہیں۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں پوری بات یہ ہے کہ یہ غیر عقلی یا غیر صحیح ہونے سے زیادہ غیر انسانی ہے۔ یعنی انسان کو مکمل طور پر نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ انسان اس وقت تک انسان ہو ہی نہیں سکتا جب تک اپنے باہر کی طرف حرکت نہ کرے۔ اپنے باہر کی طرف حرکت کرنے سے بنا ہوا آدمی ممکن ہی نہیں ہے کہ صحیح یا غلط، مقصد کے تصور سے، اس کی کشش سے آزاد ہو۔ تو جب مقصد کے تصور اور اس تصور کی کشش نے جگہ چھوڑی تو اس اکتاہٹ کو تفلسف بنایا گیا، اس اکتاہٹ کو ادبی اور تخلیقی رنگ دیا گیا یا اس اکتاہٹ کا تجربہ میسر آیا۔

سوال: سر آپ کی گفتگو میں جمالیاتی شعور کی طرف ہم بار بار آ رہے ہیں۔ تو اس لیے تھوڑی وضاحت کریں کہ جو جمالیاتی شعور ہے۔ یہ عقل یا ارادے کے تابع ہو تو اس کی بڑھوتری کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں؟

احمد جاوید: اس کی بڑھوتری کے ذرائع یہ ہیں کہ چیزوں کو اس طرح دیکھنے کی کوشش کرنا کہ جو ان کی اصل صورت ہے، وہ ان کی ذہنی صورت کے مقابلے میں نامکمل ہو جائے۔ جیسے حیدرا پاؤنڈ اپنے شاگردوں سے کہتا تھا کہ ایک پیڑ دیکھ کر آؤ اور یہاں بیٹھ کے اس کی ایک لفظی تصویر بناؤ اور ایسا عمل دس، بیس مرتبہ کرو۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہاری لکھی ہوئی

امیج جو ہے وہ اس پیٹر سے زیادہ مکمل ہوگی۔ تو جمالیاتی شعور کو اگر بڑھانا ہے تو چیزوں کو اس طرح دیکھنا ہے کہ چیزیں میرے دیکھنے کے عمل سے مکمل ہو جائیں۔ اور دوسرا ذریعہ ہے زبان میں رسوخ پیدا کرنا۔ زبان اور اپنی اردگرد کی اشیاء کی گہرائیوں میں جانے کی مشق سے جمالیاتی شعور کو غذا حاصل ہوتی ہے۔ ایک لفظ کو چار معانی میں استعمال کرو۔ ایک فقرے کو تین انداز سے لکھو ان سب مشقوں سے آدمی کی جمالیاتی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر یہ دیکھنا۔ جو آخری بات ہے جو میرے خیال میں سب سے مکمل بات ہے، یہ تو سب عملی باتیں ہیں۔ ابھی کسی صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ Perception جو ہے وہ اس وقت بنتی ہے، مطلب باہر کی چیز کا ذہن میں عکس اس وقت بنتا ہے جب اس کی حضوری پہلے پہنچے اس کی معنویت بعد میں پہنچے۔ جب بھی کسی چیز پہ غور کریں تو اس کا احساس پہلے ہو اس کا مفہوم بعد میں بنے۔ چیزیں جو ہیں ناں وہ اصل میں موجود اور حضور ہیں اور حضوری جو ہے وہ ایک ماورائے ذہن طریقے سے منتقل ہوتی ہے اپنے ناظر میں۔ اس چینل میں آئے بغیر جمالیاتی شعور کی تربیت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ چیزیں اپنی تسکینی سرشاری کے ساتھ پہلے واضح ہوں اور اپنے وثوقی معانی کے ساتھ بعد میں۔

وسیم عباس: جیسا کہ آپ نے انسانی شعور کی تین سٹیج بتائیں اخلاقی شعور، جمالیاتی شعور، عقلی شعور، سر جمالیاتی شعور کا طریقہ کار کیا ہوگا کہ اخلاقی شعور اور جمالیاتی شعور کے آپس میں ٹکراؤ سے بچا جا سکے۔

احمد جاوید: جمالیاتی شعور میں گراوٹ پیدا ہو جانا اس کی موت کا سبب بنتا ہے۔ عقل گراوٹ کو برداشت کر لیتی ہے۔ اسے صحیح کر لیتی ہے۔ لیکن جمالیاتی مزاج میں گراوٹ پیدا ہو جائے تو اس کا علاج اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ جاننا کہ میرے جمالیاتی شعور میں گراوٹ کے یہ عناصر داخل ہوگئے ہیں۔ یہ ہر ایک کے لیے ممکن ہے۔ یہ کوئی عالمانہ مسئلہ یا فلسفیانہ مسئلہ نہیں ہے۔ گراوٹ کے ان عناصر کی طرف خبردار رہنا، اور اس سے لڑنا، یہ اخلاقی شعور ہی کی کمک سے ممکن ہے۔ اخلاق اور جمالیات میں یہ تعلق جو ہے یہ لازم ہے کہ اخلاق، جمالیاتی شعور کو خود اپنی نظر میں گراوٹ سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور اس کی تربیت کا جو طریقہ ہے، جیسا کہ میں ایک مثال کے ذریعے بتاتا ہوں۔ مثال کے طور پر قرآن شریف کی تلاوت شروع کریں تو اس وقت تک اسے ختم نہ کریں اس وقت تک اس عمل سے باہر نہ نکلیں جب تک قرآن "محسوس" نہ ہونے لگے۔ اس ایک عمل سے ہم اپنے شعور کی تمام فکلٹیز، خصوصاً جمالیاتی شعور کو نمو دینے کا ایک سرچشمہ دریافت کر لیں گے۔ مطلب یہ کہ کوئی بھی چیز ہو کوئی متن آپ پڑھ رہے ہوں اس متن کی تاثیر محسوس کیے بغیر اسے بند نہ کریں۔ یہ کر کے دیکھ لیجئے۔

صوفیہ حسین: جیسا کہ ڈاکٹر نجیبہ نے کہا کہ آپ کو سننا بہت اعزاز کی بات ہے اور میں اتنے خوبصورت الفاظ میں تعریف شاید نہ کر سکوں جس طرح انہوں نے کی ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ جب ہم پوسٹ ماڈرن ڈیویلپمنٹ کی بات کرتے ہیں۔ مغربی نقطہ نظر سے جیسے پوسٹ سٹرکچرازم ہے۔ ڈی کنسٹرکشن ازم ہے۔ جب ہم ان پہلوؤں سے ادب کو دیکھتے ہیں

تو جیسے آپ نے جمالیاتی شعور کی بات کی ہے آپ کی کیا رائے ہے کہ جب پوسٹ ماڈرن کرٹیکل ڈویلپمنٹ کی نظر سے دیکھتے ہیں، ادب کو تو ادب کتنا ادب رہ جاتا ہے؟

احمد جاوید: بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ بالکل نہیں رہ جاتا۔ بالکل نہیں رہ جاتا اور مطلب یہ کہ ادب کا جوہر مارے بغیر اس پر آپ بیرونی تھیوری لاگو نہیں کرسکتے کیونکہ جمالیات بہت سختی سے مقامی ہوتی ہے۔

عزیز ابن الحسن: آپ نے ابھی اقبال اور نیرودا کی بات کی۔ اقبال کے تصورِ فن کا تو ہمیں معلوم ہے۔ سوال ہے کہ کیا نیرودا کے ہاں بھی تھیوری آف آرٹ ہے؟ اس کے بارے میں بھی ہمیں کچھ بتائیں؟

احمد جاوید: نیرودا کی ایک بڑی نظم ہے۔ جو تاریخ شعر کے عظیم ترین کارناموں میں سے ایک ہے۔ یعنی صرف اپنے عہد کی نہیں، شاعری کی تاریخ میں جو سب سے بڑی نظمیں لکھی گئیں ہیں ہومر سے لے کر آج تک، ان میں شامل ہے "Hights of Machhu Picchu" لمبی نظم ہے۔ ویسی نظم اردو میں ڈھونڈنا عبث ہے۔ تو اس میں اس کے نویں یا دسویں کنٹو میں اس نے ایک تھیوری لکھی ہے۔ شاعرانہ زبان میں نہیں بلکہ تنقیدی اصطلاحوں میں۔ کیونکہ نظم کا پھیلاؤ یا عرصہ بڑا ہو تو اس میں یہ سب کھپ جاتا ہے۔ جیسے ''ویسٹ لینڈ'' میں فلسفہ بالکل خالص حالت کے ساتھ ہے۔ نیرودا نے اس نظم میں جو تھیوری لکھی ہے اور جیسے پڑھ کے مولانا حالی یاد آتے ہیں کہ شاعری اور ادب کو اس افادیت سے خالی نہیں ہونا چاہیے جسے حاصل کرنے سے آدمی شرمندہ نہیں ہوتا۔ اس تھیوری کو اگر ہم اپنی زبان میں کہیں تو یہ ہے کہ شاعری سے ایسے مفادات ضرور پورے ہونے چاہیں جو نفس کی برتر سطحوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ شاعری ان مطالبات کی تکمیل کرنے کی مکلّف ہے۔ تو یہ اس کا خلاصہ ہے اور اس کو پڑھتے وقت ہمیشہ مولانا حالی یاد آتے ہیں۔ ہمیشہ اقبال یاد آتے ہیں۔